ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

مولانا محمد طاسین

زیرنظر مضمون میں میرا اصل مقصد، جس خاص مسئلہ کی شرعی حیثیت سے بحث وتحقیق کرنا ہے وہ مسئلہ ہے ادھار پر کوئی چیز اس قیمت سے زائد قیمت پر فروخت کرنا جو قیمت اس چیز کی بازار میں بصورت نقد رائج ہو مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں عام طور پر بصورت نقد ایک سو روپے ہے اس کو مثلاً ایک سال کے ادھار پر ایک سو پچاس روپے میں فروخت کرنا اور خریدنا۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے یعنی اس میں جس معاشی معاملے کا ذکر ہے قرآن وحدیث کی رو سے یہ جائز معاملہ ہے یا ناجائز معاملہ؟ اس بحث وتحقیق میں اس کا تعین کرنا اصل مقصود ہے اور یہ اس لئے کہ متعدد اشخاص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا ہے اور یہ ایک زندہ مسئلہ ہونے کے ساتھ اپنے اثرات و معروضی نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور ضروری مسئلہ بھی ہے۔

بحث کے شروع میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت میں کسی مسئلہ و معاملہ کے متعلق شرعی حکم صرف وہی ہوسکتا ہے جس کا تفصیلی یا اجمالی ثبوت قرآن وحدیث میں موجود ہو کیونکہ شریعت اسلامی کا حقیقی مآخذ وسرچشمہ صرف قرآن وحدیث ہیں لہٰذا اصلاً اس بحث کا دائرہ انہی تک محدود رہے گا، تعامل صحابہ کرام دراصل کتاب وسنت پر مبنی ہے لہٰذا کسی مسئلہ اور معاملہ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کے لئے اس کو دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے، محدثین کرام کے ہاں حدیث کا جو وسیع مفہوم ہے اس میں آثار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، مطلب یہ کہ کسی اور معاملہ کے شرعی جواز وعدم جواز کے متعلق صرف اتنا کافی نہیں کہ فقہ وفتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کی اس نص اور دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی بناء پر اس فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے اور یہ اس لئے بھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے جج حضرات کسی فقیہ کے قول کو صرف اس وقت مانتے ہیں جب اس کے ساتھ قرآن وحدیث کی کوئی دلیل موجود ہو کیونکہ دستور مملکت پاکستان کے اندر صرف قرآن وحدیث کو اسلامی احکام کا مآخذ تسلیم کیا گیا ہے۔

☆ فرض وہ فعل ہے جسے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہو اور جسے جان بوجھ کر ترک کرنا سخت گناہ ہے ☆

اصل مسئلہ پر بحث سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے قرآن و حدیث کی رو سے قطعی طور پر جائز ہے اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے اور یہ بھی کہ بعض دفعہ ادائیگی کے وقت آپ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔ قرآن و حدیث میں قرضِ حسنہ کے متعلق جو تعلیم ہے اس سے بھی صریح طور پر اس ادھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو، کسی ضرورت مند کو ادھار پر اس کی ضرورت کی چیز اسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو قرضۂ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے جو بڑے اجر و ثواب کا نیک عمل ہے بعض احادیث میں اس کو صدقہ سے تعبیر فرمایا ہے جو نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب و مستحسن عمل ہے۔

اسی طرح بیع مرابحہ کی بھی وہ شکل قطعی طور پر جائز ہے جس میں فروخت کی جانے والی شے کی اصل قیمت بھی صحیح بتلائی گئی اور اس پر نفع کی مقدار بھی صرف اتنی لگائی گئی ہو جو تاجروں کے ہاں اور بازار کے عام رواج کے مطابق ہو یا اس سے بھی کم ہو، مثلاً اگر بازار میں عام طور پر نفع کی مقدار دس فیصد رائج ہو اور مرابحہ میں فروخت کرنے والا فروخت کی جانے والی شے کی اصل قیمت پر زیادہ سے زیادہ دس فیصد نفع لگائے مثلاً جو شے اس کی سو روپے میں پڑی ہے اس پر نفع دس روپے یا اس سے کم لگا کر بیع مرابحہ کے طور پر فروخت کرے تو اس کے جواز میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ بالفاظِ دیگر بازار میں عام نرخ کے مطابق ایک چیز کی قیمت ایک سو روپے تھی اور مرابحت کی شکل میں بھی وہ ایک سو روپے میں ہی فروخت کی گئی یا مثلاً رعایت کے ساتھ ایک سو پانچ میں فروخت کی گئی تو بیع مرابحہ کی یہ صورت بالکل جائز ہوتی ہے اور شرعی طور پر یہ معاملہ قطعاً درست ہوتا ہے کیونکہ اس میں فریقین معاملہ کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے اور یہ اس وجہ سے موجود ہوتی ہے کہ اس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا اس کی مرضی کے مطابق معاوضہ پایا جاتا ہے جو قلبی رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہے، بخلاف مرابحت کی ایسی شکل کے کہ جس میں فروخت کرنے والا خریدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز بازار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نفع پر فروخت کرتا ہے مثلاً یہ دیکھتے ہوئے کہ خریدار نقد ادائیگی نہیں کر سکتا کچھ عرصہ کے ادھار پر لینا چاہتا ہے لہٰذا ادھار کی وجہ سے نفع دس فیصد کی بجائے بیس یا تیس فیصد لگا دیتا ہے اس صورت میں خریدار کی اگرچہ ظاہری طور پر رضامندی

موجود ہوتی ہے لیکن حقیقی طور پر موجود نہیں ہوتی کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیز وہ ادھار کی وجہ سے مثلاً ڈیڑھ سو روپے میں خرید رہا ہے وہ بازار میں بصورت نقد سو روپے میں ملتی ہے اور یہ کہ فروخت کرنے والا دوسرا فریق اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس روپے کا اضافہ کر رہا ہے چنانچہ وہ ضرورت کے تحت لے تو لیتا ہے لیکن دل سے خوش نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کے لئے پچاس روپے کا مادی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا مرابحہ کی یہ شکل بلحاظِ حقیقت درست نہیں ہوتی بلکہ باطل معاملہ کی تعریف میں آتی ہے اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

اب میں اپنے اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ ادھار کی صورت میں کوئی چیز نقد قیمت کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا شرعاً کیسا ہے جائز ہے یا ناجائز؟ جہاں تک جواز کا تعلق ہے انتہائی تلاش وجستجو کے باوجود مجھے قرآنِ حکیم، احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے معاملہ مذکور کا جواز نکلتا اور ثابت ہوتا ہو، البتہ عدم جواز کے متعلق قرآن، حدیث اور آثار صحابہ میں واضح اور قطعی دلائل ملتے ہیں، تحریم ربوٰ سے متعلق جو آیات، احادیث اور آثار ہیں ان سے معاملہ زیر بحث کا قطعی طور پر ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے وہ اس طرح کہ قرآنِ حکیم نے عہد جاہلیت کے جس متعارف ربوٰ کو قطعی طور پر حرام وممنوع قرار دیا ہے اس کی چند شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی تھی کہ ایک شخص دوسرے پر کوئی چیز ادھار بیچتا تو مدت قرض کے لحاظ سے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں ایک سو درہم ہوتی ایک سال کے ادھار لو ڈیڑھ سو درہم میں بیچتا پھر جب ایک سال کے بعد بھی مقروض ڈیڑھ سو درہم ادا نہ کر سکتا تو قرض خواہ اس سے کہتا میں مدت قرض میں مزید اتنا اضافہ کر دیتا ہوں تم اپنے ذمہ رقم کی مقدار اتنی بڑھا دو چنانچہ رقم قرض کی مقدار مزید ایک سال کے لئے دو سو درہم کر دی جاتی پھر اگر دوسری مدت میں بھی وہ ادا نہ کر سکتا تو مزید مہلت کے عوض قرض کی رقم میں مزید اضافہ کر دیا جاتا بڑھتے بڑھتے یہ رقم اصل سے کئی گنا ہو جاتی یعنی اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً بن جاتی، یہی حال نقد کے قرض میں بھی ہوتا ہے ایک آدمی دوسرے کو مثلاً سو درہم ایک سال کے لئے قرض دیتا تو اس مدت کے لحاظ سے اس میں اضافہ کر دیا جاتا جو درمیان میں ہر ماہ یا سال کے بعد یکمشت اصل کے ساتھ واجب الادا ہوتا جیسا کہ موجودہ بینکاری نظام میں ہوتا ہے۔ غرضیکہ قرآنِ حکیم نے ربوٰ النسیۃ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا ان میں ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل

میں تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربوا کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

(۱) عن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ قال کان الربوٰ الذی اذن اللہ فیہ بالحرب لمن لم یترکہ عند الجاھلیۃ یکون للرجل علی رجل حق الی اجل فاذا اجل الاجل قال صاحب الحق أتقضی ام تربی، فان قضاء اخذ منہ والا طواہ۔ (جامع الاصول، ج ۱، ص ۵۷۳)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا وہ ربوٰ جس کو ترک نہ کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اعلان جنگ فرمایا عہد جاہلیت میں اس کی شکل اس طرح تھی کہ آدمی کا دوسرے پر ایک خاص مدت تک کے حق یعنی دین وقرض ہوتا پس جب مقررہ وقت آتا تو صاحب حق یعنی قرض خواہ اپنے مقروض سے کہتا ادا کرتے ہو یا مزید مہلت کے عوض مال قرض میں اضافہ کرتے ہو اگر وہ ادا کرتا تو لے کر معاملہ ختم کر دیتا ورنہ اس کو ہر مرتبہ بڑھاتا چلا جاتا۔

(۲) عن مجاھد انہ قال فی ربوٰ الذی نھی اللہ عنہ کان فی الجاھلیۃ یکون للرجل علی الرجل دین، فیقول لک کذا وکذا وتؤخر عنی فیؤخر عنہ۔ (تفسیر الطبری، ج ۳، ص ۲۷)

حضرت مجاہد نے فرمایا ربوٰ جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا عہد جاہلیت میں اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا دوسرے آدمی پر واجب الاداء دین وقرض ہوتا جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو مقروض آدمی اپنے قرض خواہ سے کہتا مہلت بڑھا دو اور مطالبہ مؤخر کر دو اس کے بدلے آپ کے لئے اتنا اتنا مزید ہوگا چنانچہ وہ مطالبہ مؤخر کر کے مہلت بڑھا دیتا اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

(۳) عن سعید بن جبیر قال ان الرجل کان یکون لہ علی الرجل المال فاذا حل الاجل طلبہ من صاحبہ فیقول المطلوب اخر عنی و ازیدک فی مالک فیفعلان ذلک۔ (تفسیر الدر المنثور، ج ۲، ص ۷۱)

حضرت سعید بن جبیر نے ربوٰ جاہلی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ اس طرح تھی

کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر بطور قرض مال ہوتا پھر جب قرض کی مقررہ مدت پوری ہوتی تو قرض والا اپنے مقروض سے اپنا مال طلب کرتا پھر اگر مقروض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا تو مقرض سے کہتا مجھے مزید مہلت دیجئے میں اس کے عوض آپ کے مال میں آپ کے لئے اضافہ کر دیتا ہوں چنانچہ وہ آپس میں ایسا کر لیتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔

(۴) عن قتادہ قال ان ربو الجاهلية يبيع الرجل المبيع الى اجل مسمى فاذا حل الاجل ولم يكن عند صاحبه قضاء زاده واخر عنه۔ (تفسیر الطبری، ج ۳، ص ۶۷)

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا ربوٰ جاہلی کی ایک شکل یہ تھی کہ ایک آدمی اپنی کوئی چیز ایک خاص وقت تک کیلئے قرض پر بیچتا پھر جب وہ خاص وقت آتا اور اس کے مقروض کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو مال بڑھا کر مزید مہلت دے دیتا۔

(۵) عن عطاء ابن ابی رباح قال كانت ثقيف تدائن فی بنی المغيرة فی الجاهلية فاذا حل الاجل قالوا نزيدكم و توخرون۔ (تفسیر الدر المنثور، ج ۴، ص ۵۹)

حضرت عطاء بن ابی رباح نے فرمایا عہد جاہلیت میں بنوثقیف، بنوالمغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے۔ جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو بنی المغیرہ، بنوثقیف سے کہتے ہم تمہارا مال زیادہ کر دیتے آپ ہمیں مزید مہلت دے دیجئے۔

ان مذکورہ روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ربوٰ الجاہلی جس کا دوسرا نام ربو النسیئۃ ہے قرض کا ایسا معاملہ تھا جس میں مہلت اور مدت قرض کے عوض مال قرض میں اضافہ کیا جاتا تھا خواہ وہ قرض نقد کی صورت میں ہو یا کسی فروخت کردہ چیز کی قیمت کی صورت میں، اور یہ کہ اس کو قرآنِ حکیم نے حرام و ممنوع ٹھہرا کر اس خیال کی نفی اور تردید کر دی کہ قرض دینے والا مہلت قرض کے عوض مقروض سے قرض کے اصل مال پر کچھ بھی زائد مال لے سکتا ہے۔

مناسب اور مفید سمجھتا ہوں کہ ہاں اکابر مفسرین کرام کی کچھ عبارات پیش کر دوں جو انہوں نے ربائے جاہلی کی تفسیر میں فرمائی ہیں تا کہ حقیقت حال اچھی طرح واضح ہو جائے۔

والربوٰ الذی کانت العرب تعرفه و تفعله انما کان قرض الدراهم والدنا نیر الی اجل بزیادة علی مقدار ما استقرضه علی ما یتراضون به، هذاکان المتعارف المشهور عندهم. (ج۱،ص۵۵۲)

وہ ربوٰ جس کو اہل عرب جانتے پہچانتے اور کیا کرتے تھے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایک مقررہ مدت تک دراہم و دنانیر کے قرض کا معاملہ تھا جس میں یہ طے پاتا تھا کہ قرض کے اصل مال پر کچھ زائد بھی ضرور لینا دینا ہوگا ربوٰ کا یہی معاملہ عربوں کے ہاں متعارف اور مشہور تھا۔

اس کے کچھ آگے ایک اور عبارت اس طرح ہے:

ولم یکن تعاملهم بالربوٰ الاعلیٰ الوجه الذی ذکرنا من قرض دراهم و دنانیر الی اجل مع شرط الزیادة. (بحوالہٗ مذکور)

عربوں کے اندر جس ربوٰ پر عمل درآمد تھا اس کی وہی شکل تھی جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی ایک خاص مدت تک دراہم و دنانیر کا قرض جس کے ساتھ زیادتی کی شرط تھی۔

پھر دو صفحات کے بعد ایک تیسری عبارت احکام القرآن میں بایں طور ہے:

انه معلوم ان الربوٰ الجاهلیة اما کان قرضًا موجلاً بزیادة مشروطة فکانت الزیادة بدلا من الاجل، فابطله الله وحرمه وقال وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لاتظلمون ولا تظلمون. (ج۱،ص۵۵۴)

یہ ایک معلوم اور جانی ہوئی بات ہے کہ عہد جاہلیت کی ربوٰ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ زیادتی کی شرط کے ساتھ میعادی قرض کا معاملہ تھا اور اس میں قرض کے اصل مال پر جو زیادتی ہوتی تھی وہ مدت اور مہلت قرض کا بدل سمجھی جاتی تھی پس اس کو اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا اور فرمایا، اگر تم اس سے توبہ کر کے باز آ جاؤ تو پھر تمہارے لئے صرف تمہارے اصل اموال ہیں جو تم نے بطور قرض دیئے تھے نہ تم ان پر کچھ زائد لے کر اپنے مقروضوں پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل اموال روک کر تم پر ظلم کریں۔

واضح رہے کہ یہاں ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں۔

اس تیسری عبارت میں جو بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ قرض کے اصل مال پر

جو زیادتی مشروط ہوتی تھی وہ اجل یعنی مدت قرض کا عوض اور بدل سمجھی جاتی تھی۔

دوسرے مفسر امام فخر الدین الرازی نے اپنی عظیم المرتبت تفسیر مفاتیح الغیب میں جو تفسیر الکبیر کے نام سے معروف ہے ربٰو کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

اما الربٰو النسیۃ فھو الامر الذی کان مشھورا متعارفا فی الجاھلیۃ وذلک انھم کانوا یدفعون المال علٰی ان یاخذوا کل شھر قدراً معیناً ویکون رأسالمال باقیا، ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال، فان تعذر علیہ الاداء زادو فی الحق والاجل، فھذا ھو الربٰو الذی کانوا فی الجاھلیۃ یتعاملون. (ج ۷،ص ۹۱)

البتہ ربٰو النسیۃ جو عہد جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھی عملاً اس کی شکل اس طرح تھی کہ بعض لوگ اپنا مال دوسروں کو بطور قرض اس شرط پر دیتے کہ وہ ہر ماہ اپنے مقروض سے خاص مقدار میں کچھ مال بطور سود لیتے رہیں گے اور قرض کا اصل مال اپنی حالت پر باقی رہے گا پھر جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو وہ مقروض سے اصل مال کا مطالبہ کرتے پھر اگر ادائیگی اس کے لئے مشکل ہوتی تو اپنے حق اور قرض کی مہلت میں اضافہ کر دیتے، پس یہی وہ ربٰو تھی جس کا لوگ عہد جاہلیت میں لین دین اور کاروبار کرتے تھے۔

تفسیر الکبیر ہی میں ربٰو سے متعلق ایک اور عبارت اس طرح ہے۔

کان الرجل فی الجاھلیۃ اذا کان لہ علی انسان مائۃ درھم الی الاجل، فاذا جاء الاجل ولم یکن المدیون واجد الذلک قال زدنی فی المال حتی ازید فی الاجل، فربما جملہ مائتین. (ج ۹،ص ۲)

زمانۂ جاہلیت میں ایک آدمی کے کسی انسان پر ایک خاص وقت کے لئے ایک سو درہم قرض ہوتے پھر جب وہ وقت آتا اور مقروض کے پاس ادائیگی کے لئے مال نہ ہوتا تو وہ کہتا تم میرے حق میں اضافہ کر دو تا کہ میں اجل کو زیادہ کر دوں پس بسا اوقات وہ سو درہم کے دو سو درہم کر دیتا۔

مذکورہ عبارات میں اس کی تصریح ہے کہ عہد جاہلیت کی ربٰو جس کو قرآنِ مجید نے قطعی

حرام بتلایا ہے اس کے اندر جو مرکزی تصور کارفرما تھا وہ یہ کہ مقرض یعنی قرض دینے والا، مدت قرض کے بدلے قرض کے اصل مال پر کچھ زائد مال کا حقدار قرار پاتا ہے قرآنِ حکیم نے اس ربٰو کو حرام قرار دے کر اور یہ فرما کر کہ ہم قرض اپنے اصل مال پر جو بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے، تصور مذکور کی نفی کر دی ہے گویا یہ فرمایا کہ اجل اور مدت قرض کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مال کا بدل بن سکتی اور جس کا کوئی معاوضہ لیا دیا جا سکتا ہو۔

یہاں تک ربٰو الجاہلی اور ربو النسیۃ کی حقیقت ماہیت اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ جو کچھ لکھا اور عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں جب ہم اپنے زیر بحث معاملے کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت، اپنے منشاء و مقصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربو النسیۃ جیسا معاملہ ہے وہ اس طرح کہ اس میں ایک شے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جب ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ نیز جس طرح ربو النسیۃ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر زائد لیا جانے والا مال بلاعوض ہوتا اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے اسی طرح زیر بحث معاملے میں بیچی جانے والی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لئے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا اور اس کی حق تلفی کرتا ہے، نیز جس طرح ربو النسیۃ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے اسی طرح زیر بحث بیع الموجل کے معاملہ میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیدا آور محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے، پھر جس طرح ربٰو النسیۃ کے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے اسی طرح زیر بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربو النسیۃ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربو النسیۃ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع

ٹھہرایا ہے وہ سب زیر بحث بیع مؤجل کے معاملہ سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہیں۔ لہٰذا اصول قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملہ کا بھی وہی شرعی حکم ہونا چاہئے جو معاملہ ربو النسیۃ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کچھ فرق نہیں صرف لفظی فرق ہے جس کا عقود و معاملات میں شرعاً کوئی لحاظ اور اعتبار نہیں ہوتا۔ الاعتبار فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والالمبا مسلمہ قاعدہ کلیہ ہے۔

قرآنِ مجید کی جس دوسری آیت سے معاملہ زیر بحث کی شرعی حیثیت پر روشنی پڑتی اور اس کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ سورۃ النساء کی یہ آیت ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ۔ (الآیہ: ۲۹)

اے وہ لوگو! جو ایمان لاتے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کا طریقہ ہو جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو۔

اس آیت کریمہ کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں باطل طریقہ سے ایک دوسرے کا مال کھانے لینے کی ممانعت ہے اور اِلَّا حرف استثناء کے بعد دوسرے حصہ میں ایسی تجارت کے طریقہ سے ایک دوسرے کا مال لینے کی اجازت ہے جس میں ہر فریق کی حقیقی اور دلی رضامندی پائی جاتی ہو، پہلے حصہ میں جو لفظ باطل ہے حق کی ضد ہے اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ناحق کیا جاتا ہے، بعض مفسرین کرام نے باطل کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حسن بصری کا یہ قول پیش کیا ہے۔

الباطل هو كل ما يوخذ من الانسان بغير عوض۔ (تفسیر الکبیر، ج ۱۰، ص ۷۰)

ہر وہ مال لینا باطل ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض لیا جائے۔

تفسیر المنار میں علامہ رشید رضا نے باطل کی تفسیر میں لکھا ہے:

اما الباطل مالم يكن فى مقابلة شيء حقيقي۔

باطل وہ ہے جو کسی حقیقی شے کے مقابلہ میں نہ ہو یعنی اسکے بالمقابل کوئی حقیقی چیز نہ ہو۔

لہٰذا آیت مذکور کے پہلے حصہ کا مطلب ہوا مسلمانو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال

بغیر عوض کہ نہ لو، یعنی معاوضے کے معاملات میں ایک دوسرے کا مال بغیر ایسے عوض کے نہ لو جو مالیت اور قدر و قیمت میں اس کے برابر ہو کیونکہ کسی مال کا صحیح عوض اور بدل صرف وہ ہوتا ہے جو قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو بنابریں آیت کے پہلے حصہ کی رو سے ہر وہ معاشی معاملہ باطل اور ممنوع قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق کے لئے اس کے مال کا سرے سے عوض موجود ہی نہ ہو یا عوض تو موجود ہو لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے اس مال کے مساوی نہ ہو۔

آیت کے دوسرے حصہ میں معاوضے کے صرف اس معاملہ کو باطل سے مستثنیٰ اور جائز بتلایا گیا ہے جس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا بدل موجود ہوتا ہے لہٰذا فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے چونکہ تجارت یعنی بیع و شراء کا معاملہ ایسا ہی ہے اس میں بائع کو اپنی چیز کا عوض ثمن اور قیمت کی شکل میں اور مشتری کو اپنی چیز کا عوض خریدی ہوئی شے یعنی مبیع کی شکل میں ملتا ہے، البتہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع، مشتری کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز اس سے زائد قیمت پر بیچ دیتا ہے جو قیمت بازار میں عام طور پر اس چیز کی ہوتی ہے یا مشتری، بائع کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی چیز اس قیمت سے کم قیمت پر خرید لیتا ہے جو بازار میں عام طور پر ہوتی ہے، لہٰذا بیع و شراء کی ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی اس وجہ سے کہ اس کے لئے اس کی چیز کا پورا اور صحیح عوض و بدل موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیع و شراء کا ایسا معاملہ ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز و ممنوع قرار پاتا ہے جہاں تک ظاہری اور زبانی رضامندی کا تعلق ہے وہ تو معاملہ ربٰو میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ربٰو کا معاملہ حرام و ممنوع رہتا ہے بلکہ حقیقت میں رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا صحیح عوض و بدل موجود ہونا ہے وہ موجود ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود ہونا ہے اور موجود نہ ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود نہ ہونا ہے، آیت مذکور کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا اس کی روشنی میں معاملہ زیر بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ، باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے کیونکہ اس میں بیچنے والا ادھار کی وجہ سے اپنی سو روپے کی چیز جو ڈیڑھ سو میں بیچتا ہے تو اس میں خریدار سے جو پچاس روپے زائد لیتا ہے ان کا کوئی عوض اس کی طرف سے خریدار کے لئے موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ بغیر عوض کے دوسرے کا مال لیتا ہے جس کو آیت کے اندر باطل سے تعبیر کر کے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، نیز یہ بیع و شراء کا ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جس میں ایک فریق کے لئے اس کی چیز کا

عوض موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کی رضامندی موجود نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ اس میں خریدار کے لئے مذکورہ بالا مثال کے مطابق پچاس روپے کا عوض موجود نہیں ہوتا جو قرض کی وجہ سے بیچنے والا خریدار سے لیتا ہے لہٰذا اس کی حقیقی رضامندی بھی موجود نہیں ہوتی لہٰذا اس پہلو سے بھی یہ معاملہ ناجائز اور ممنوع قرار پاتا ہے۔

زیر بحث معاملہ کی شرعی حیثیت سے متعلق جہاں تک احادیث نبویہ کا تعلق ہے تو متعدد احادیث سے بھی اس کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے ان بکثرت احادیث سے بھی جن میں ربوٰ کی سختی کے ساتھ مذمت اور ممانعت ہے طوالت سے بچتے ہوئے میں ان کو یہاں نقل اور ذکر نہیں کر رہا۔ بیع عینہ کی ممانعت سے متعلق جو احادیث ہیں ان سے بھی اس معاملے کا عدم جواز مفہوم و مستنبط ہوتا ہے البتہ یہاں میں اس حدیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں ربوالنسیۃ کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے حدیث کی بعض کتابوں میں وہ ان الفاظ سے ہے۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل قرض جر منفعة فهو الربو۔ (بلوغ المرام)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربوٰ ہے۔

مطلب یہ کہ جو قرض قرض دینے والے کے لئے قرض لینے والے کی طرف سے مالی منفعت کا سبب اور ذریعہ بنتا ہو وہ ربوٰ ہے۔ اس حدیث کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ سند کے لحاظ سے اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کے مضمون کی تائید چونکہ متعدد آثار صحابہ کرام سے ہوتی ہے لہٰذا اس کو ہمیشہ قابل اعتماد سمجھا گیا اور فقہاء کرام اس سے استدلال کرتے رہے ہیں، صحابہ کرام کے وہ آثار جن سے اس حدیث کو تقویت ملتی ہے سنن الکبریٰ للبیہقی اور اعلاء السنن وغیرہ میں مذکورہ ہیں، ان آثار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قرض دینے والا قرض کی وجہ سے اپنے مقروض سے کسی طرح کا کوئی مادی فائدہ اٹھائے اگرچہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، میں بغرض اختصار ان کو یہاں نقل نہیں کر رہا جو دیکھنا چاہے مذکور کتب میں دیکھ سکتا ہے مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ربوٰ کے موضوع پر اپنے رسالہ کشف الدجیٰ میں ان کو یکجا جمع کر دیا ہے جو امداد الفتاویٰ میں بھی شامل ہے، بہرحال اس حدیث کی رو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے کیونکہ یہ

ایک واضح حقیقت ہے کہ جو شخص مثلاً ایک سو روپے کی چیز ادھار پر ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرتا ہے وہ پچاس روپے جو زائد لیتا ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قرض سے فائدہ اٹھاتا اور منفعت اندوز ہوتا ہے اگر قرض نہ ہوتا تو نقد کی صورت میں اس کو اس چیز کے صرف سو روپے ملتے، پھر جب یہ معاملہ حدیث مذکور کے مطابق ربٰو کی تعریف میں آتا ہے تو اس کا بھی وہی شرعی حکم ہو سکتا ہے جو ربٰو وسود کا ہے یعنی حرام و ناجائز ہونا۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس کی بناء پر پورے وثوق و یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث معاملہ قرآن و حدیث کی رو سے حرام اور ناجائز معاملہ ہے۔

بیع مرابحہ کی حیثیت:

اس کے بعد یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بعض علماء کرام نے اپنی کتابوں میں بطور فتویٰ لکھا ہے کہ معاملہ مذکور شرعاً جائز معاملہ ہے یعنی شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زائد قیمت پر بیچی جائے چنانچہ اس فتوے کے پیش نظر بلاسود بینکاری کے لئے سود کے متبادل جو معاملات تجویز کئے گئے ہیں ان میں سے ایک معاملہ یہ بھی ہے گویا بینک کو اس کی اجازت دے دی گئی ہے کہ اس سے کوئی شخص مشین وغیرہ خریدنے کے لئے قرضہ مانگے تو وہ اس کو سود پر نقد دینے کی بجائے اس سے کہے کہ میں تیری مطلوبہ چیز خرید کر تم کو ایک سال کے ادھار پر دے دیتا ہوں اور ادھار کی وجہ سے مرابحہ کے نام پر اس کی اتنی قیمت لگائے جو بازار کی مروجہ قیمت سے کہیں زائد ہو مثلاً یہ کہے کہ یہ چیز جو مجھے سو روپے میں پڑی ہے پچاس روپے کے نفع کے ساتھ بیچتا ہوں تم ایک سو پچاس روپے ایک سال کے بعد ادا کر دینا، مطلب یہ کہ اس طرح کے معاملہ کو بینک کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے جو حقیقت میں اپنے مقصد اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰو کی طرح کا معاملہ ہے اگرچہ اس کو بیع مرابحہ اور بیع مؤجل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، ویسے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا بیع مرابحہ بھی شرعاً جائز ہے جب اس میں ربح و نفع کی مقدار بازار کے عام عرف و رواج کے مطابق ہو، اسی طرح بیع مؤجل بھی شرعاً جائز ہے جب بیچی جانے والی چیز کی قیمت ادھار میں بھی اتنی ہی ہو جتنی نقد کی صورت میں تھی۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات علماء کرام معاملہ زیر بحث کو شرعاً جائز سمجھتے

اور کہتے ہیں ان کے وہ دلائل کیا ہیں جن کی بناء پر وہ ادھار کی چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کو جائز و درست مانتے ہیں۔لیکن اس بارے میں نہ میں اُن حضرات میں سے کسی کا اسم گرامی ذکر کروں گا اور نہ اس کتاب کا نام لکھوں گا جس میں کسی نے ایسا لکھا ہے بلکہ صرف وہ دلائل ذکر کروں گا جو ان حضرات نے اپنے مؤقف کے ثبوت میں پیش فرمائے ہیں اور فیصلہ ایسے اہل علم حضرات پر چھوڑ دوں گا جو استدلال اور استنباط کے مختلف طریقوں کا غیر معمولی علم وفہم رکھتے۔صحیح اور غلط استدلال کے درمیان تمیز کر سکتے اور فیصلہ کرنے میں انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔

قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران ومتعجب ہوں گے کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں نہ قرآنِ مجید کی آیت پیش کرتے ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث، نہ آثار صحابہ وتابعین میں سے کوئی اثر، نہ آئمہ مجتہدین کا کوئی اجتہادی قول اور نہ مسلمہ قواعد فقیہ میں سے کوئی قاعدہ پیش فرماتے ہیں بلکہ اس کے ثبوت میں بطور دلیل فقہ حنفی کی دو کتابوں مبسوط اور ہدایہ کی ایک ایسی عبارت پیش کرتے ہیں جس سے کسی طرح یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا خریدنا شریعت اسلامی کی رو سے جائز ہے۔ اس عبارت کو پیش کرنے سے پہلے جس سے ان حضرات نے استدلال فرمایا ہے اس سیاق وسباق کا بیان ضروری سمجھتا ہوں جس میں وہ عبارت ذکر ہوتی ہے تا کہ حقیقت واقعہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جس سیاق وسباق میں وہ عبارت واقع ہے اس کی کچھ تفصیل یہ کہ فقہ حنفی کی مذکورہ بالا کتابوں میں جہاں بیع مرابحہ کی بحث ہے اس میں بیع المرابحہ کی فقہی تعریف، اس کی صحت کی شرائط اور اس کی مختلف شکلوں اور ان کے متعلق شرعی احکام کا بیان ہے، بیع مرابحہ خرید وفروخت کا ایسا معاملہ ہے جس میں کوئی شخص یہ کہہ کر اپنی کوئی چیز دوسرے پر فروخت کرتا ہے کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی یا مجھے اتنے میں پڑی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں اور دوسرا اس پر اعتماد و بھروسہ کر کے وہ چیز خرید لیتا ہے گویا اس میں کوئی چیز اس کی قیمت خرید پر متعین نفع کے ساتھ بیچی خریدی جاتی ہے، چونکہ اس بیع میں سچائی اور دیانتداری بنیادی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کو بیع الامانۃ بھی کہا جاتا ہے اس بیع کی صحت اور تکمیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ حقیقتاً جھوٹ اور خیانت موجود نہ ہو بلکہ اس کا شبہ بھی نہ پایا جاتا ہو چنانچہ یہی وجہ ہے کہ معاملہ طے پا جانے کے بعد اگر جھوٹ و خیانت کا شبہ ظاہر ہو جائے تو خریدار کو اس کے رد وقبول کا خیار ہوتا ہے چاہے تو

اس کو برقرار رکھے اور چاہے تو ختم کردے۔

بیع المرابحہ کی وہ شکلیں جن میں جھوٹ و خیانت کے شبہ کی بناء پر خریدار کو معاملہ طے ہو جانے کے بعد رد وقبول کا خیار ہوتا ہے ان میں سے ایک شکل جس کا امام محمد الشیبانی نے اپنی کتاب جامع الصغیر میں ذکر کیا ہے اس طرح ہے:

من اشترىٰ غلاماً بالف درهم نسية فباعه بربح مائة درهم ولم يبين، فعلم المشترى فان شاء ردّه وان شاء قبل۔

ایک شخص نے ایک غلام ایک ہزار روپے میں ادھار پر خریدا اور پھر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو فروخت کیا اور خریدار کو یہ نہیں بتلایا کہ میں نے ایک ہزار درہم میں ادھار پر خریدا تھا، معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو اس کا علم ہوا تو ایسی صورت میں اس کو رد وقبول دونوں کا اختیار ہوتا ہے۔

جامع الصغیر میں امام محمد نے عبارت مذکور کے بعد اس کی کوئی توجیہہ نہیں فرمائی کہ اس صورت میں خریدار کو معاملے کے رد کا کیوں اختیار ہوتا ہے اس کی عقلی طور پر کیا وجہ ہے، لیکن بعد کے بعض حنفی فقہاء کرام نے مذکورہ جزیے کو نقل کرنے کے بعد اس کی توجیہہ بھی لکھی ہے، شمس الائمہ السرخسی نے اپنی کتاب المبسوط میں اس کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"قال رحمه الله واذا اشترىٰ شيئًا نسية فليس له ان يبيعه مرابحة حتى يتبين انهُ اشتراه نسية لان بيع المرابحة بيع الامانة تنفى عنه كل تهمة و جناية و ينحرز فيه من كل كذب وفى معاريض الكلام شبهة فلا يجوز استعمالها فى بيع المرابحة، ثم الانسان فى العادة يشترى الشيء بالنسية باكثر مما يشترى بالنقد." (المبسوط: ج ۱۳، ص ۷۸)

اس عبارت کا وہ حصہ جو اس وقت مقصود بحث ہے وہ ہے:

ثم الانسان فى العادة يشترىٰ الشيء بالنسية باكثر مما يشترى بالنقد۔

پھر انسان عادۃً ادھار کی چیز اس قیمت سے زائد پر خرید لیتا ہے جو نقد کی صورت میں ہوتی ہے۔

مطلب یہ کہ ادھار پر خریدی ہوئی شے جب مرابحہ کے طور پر فروخت کی جائے تو

امانتداری اور راست گوئی کا تقاضا یہ ہے کہ فروخت کرنے والا، خریدار کو صاف بتلا دے کہ یہ شے میں نے ادھار پر اتنے میں خریدی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں اور یہ کہ بتلا دینا اس لئے ضروری ہے کہ حاجت مند انسان جب کوئی شے ادھار پر خریدتا ہے تو عادۃً بمقابلہ نقد کے زیادہ قیمت پر خرید لیتا ہے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہ چیز بھی اس نے اپنی حاجتمندی اور ناداری کی وجہ سے زیادہ قیمت پر خریدلی ہو جو بصورت نقد بازار میں اس کی نہ ہو اور اب چونکہ وہ نقد کی صورت میں فروخت کر رہا ہے، ادھار کی صورت میں نہیں کر رہا لہٰذا اس پر لازم ہے کہ خریدار کو اس حقیقت سے آگاہ کردے چنانچہ آگاہ ہو جانے کے بعد بھی اگر وہ اس کو مطلوبہ قیمت پر خرید لیتا ہے تو پھر اس کو طے شدہ معاملہ فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا بخلاف اس صورت کے کہ وہ خریدار کو اس سے آگاہ نہیں کرتا اور معاملہ طے پا جانے کے بعد اس کو اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس معاملے کو فسخ کرسکتا ہے۔

مبسوط کی مذکورہ عبارت میں جس انسان اور اس کی عادت کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ وہی ہوسکتا ہے جو کسی چیز کا حاجتمند ہو اور ناداری کی وجہ سے نقد پر نہ خرید سکتا ہو اور اس کو وہ چیز نقد کی قیمت پر بطور قرضہ حسنہ کے بھی نہ مل سکتی ہو ایسا انسان اپنی حاجت براری کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ وہ ادھار دینے والے کی مرضی کے مطابق زیادہ قیمت پر خرید لے، اور لفظ عادت کا مطلب ہے کہ ایسا ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ ایسا لازماً اور دائماً ہوتا ہے کیونکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرض حسن کی اسلامی تعلیم پر عمل کرنے والے اور ربوٰ کی ہر شکل سے بچنے اور اجتناب کرنے والے متقی مسلمان، جب کسی حاجتمند انسان کو اس کی ضرورت کی چیز ادھار پر دیتے ہیں تو اسی قیمت پر دیتے ہیں جو بصورت نقد بازار میں اس کی رائج ہوتی ہے ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر نہیں دیتے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مادی فائدہ کے بغیر کسی کو قرض نہیں دیتے اور اپنے معاشی معاملات میں اسلامی اصول و احکام اور حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتے، لہٰذا ایسے لوگوں کا رویہ اور طرزِ عمل شریعت اسلامی کی رو سے جائز و درست نہیں ہوتا، شمس الائمہ السرخسی کی مذکورہ عبارت میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ ان کے نزدیک لوگوں کی مذکورہ عادت شرعاً جائز و درست عادت ہے رہا یہ سوال کہ پھر انہوں نے اس کو ناجائز کیوں نہیں لکھا تو اس کا جواب یہ کہ یہاں ان کا مقصد اس عادت کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد بیع المرابحہ کی ایک خاص شکل سے متعلق امام محمد کے مذکورہ قول کی توجیہ کرنا ہے جو عادت مذکور کے ناجائز ہونے کی

شکل میں بھی ہو جاتی ہے۔

مبسوط کی مذکورہ عبارت کے بعد اب میں صاحب الہدایہ علامہ المرغینانی کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جس سے زیر بحث معاملے کے جواز کیلئے استدلال فرمایا گیا ہے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

قال من اشترى غلاماً بالف درهم نسية فباعه بربح مائة ولم بين، فعلم المشترى فان شاء ردّه وان شاء قبل لان للاجل شبها بالمبيع الا يرى انه يزداد فى الثمن لاجل الاجل، والشبهة فى هذا ملحقة بالحقيقة فصار كانه اشترىٰ شيئين وباع احدهما مرابحة بثمنهما۔

(ہدایہ آخرین، ص ۵۷۔۵۸)

امام محمدؒ نے کہا جس نے ایک ہزار درہم کے بدلے ایک غلام ادھار پر خریدا اور پھر مرابحہ کے طور پر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو بیچ ڈالا اور خریدار کو نہیں بتلایا کہ میں نے ادھار پر خریدا تھا بعد میں خریدار کو اس کا علم ہوا پس اب اگر وہ چاہے تو اس کو ردّ اور چاہے تو اس کو قبول کر سکتا ہے کیونکہ اجل یعنی قرض کی مہلت اور مدت بیچی جانے والی چیز سے کچھ مشابہت رکھتی ہے کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے، اور چونکہ مرابحت کے باب میں شبہ مبیع کو حقیقت مبیع سے ملحق کر دیا گیا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ گویا بیچنے والے نے جس قیمت میں دو چیزیں خریدی تھیں یعنی غلام اور اجل، اس قیمت پر ان میں سے ایک چیز کو یعنی غلام کو بیچ دیا۔

اس عبارت میں مقصود بحث اس کا وہ حصہ ہے جس میں صاحب ہدایہ نے امام محمد کے قول مذکور کی توجیہ پیش فرمائی ہے یعنی مرابحہ کی مذکورہ شکل میں معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو معاملہ فسخ کرنے کا جو اختیار حاصل ہوتا ہے عقلی طور پر اس کی وجہ کیا ہے وہ وجہ صاحب ہدایہ کے نزدیک مرابحہ کی اس شکل میں شبہ خیانت کا پایا جانا ہے جس سے بیع مرابحہ کو پاک ہونا چاہئے کیونکہ بیع المرابحہ، بیع الامانۃ ہے، اور شبہ خیانت کی جو وضاحت انہوں نے فرمائی ہے وہ یہ کہ جو شخص ادھار پر کوئی چیز خریدتا ہے اس کے متعلق گو یقین نہ سہی لیکن یہ شبہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس نے جس قیمت میں وہ چیز خریدی ہے وہ قیمت تنہا اس چیز کی نہ ہو بلکہ ادھار کی جو اجل اور مہلت ہے اس کی بھی ہو کیونکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ادھار کی مہلت اور مدت کی وجہ سے فروخت کی جانے والی چیز کی

قیمت بڑھا دیتے لہٰذا ادھار پر خریدی ہوئی ہر چیز کے متعلق یہ شبہ ضرور ہوسکتا ہے کہ اس کی جو قیمت ہے وہ تنہا اس کی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اجل اور مہلت ادھار کی بھی ہو بنابریں جو شخص نقد کی صورت میں بھی شے کی وہی قیمت وصول کرتا ہے جو ادھار کی صورت میں اس شے کی تھی تو وہ گویا دو چیزوں کی قیمت ایک چیز سے وصول کرتا ہے کیونکہ نقد کی صورت میں اجل نہیں ہوتی صرف چیز ہوتی ہے لہٰذا وہ ایک طرح کی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے جو مرابحت کے معاملہ میں عیب ہے اور چونکہ مبیع میں عیب ظاہر ہونے کی صورت میں خریدار کو ردّ وقبول کا خیار ہوتا ہے لہٰذا بیع المرابحہ کی اس شکل میں بھی خریدار کو ردّ وقبول کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اس توجیہ کے ضمن میں صاحب ہدایہ نے اپنی اس بات کی تائید میں کہ اجل، مبیع سے کچھ مشابہ ہے فرمایا الا یری انہ یزداد فی الثمن لاجل الاجل کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل یعنی ادھار کی مدت کی وجہ سے شے کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے، اس سے بعض اہل علم حضرات نے یہ مطلب نکالا ہے کہ ادھار کی چیز کی قیمت بمقابلہ نقد کے بڑھا دینا شریعت اسلام کی رو سے جائز ہے حالانکہ عبارت مذکور سے یہ مطلب بالکل نہیں نکلتا اس عبارت میں جو بات کہی گئی بلحاظ واقعہ بالکل درست ہے کہ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں یعنی ادھار کی چیز کی قیمت زیادہ کر دیتے ہیں لیکن ان کا ایسا کرنا، قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہوتا ہے یا ناجائز؟ عبارت مذکور کے کسی لفظ سے اس کا اظہار نہیں ہوتا اس لئے کہ صاحب ہدایہ کا مقصد یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اجل کی مبیع سے کچھ مشابہت یا اجل کے متعلق مبیع ہونے کا شبہ ہے کیونکہ کچھ لوگ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرتے ہیں یہاں ان کا مقصد اس کے جواز وعدم جواز سے بحث کرنا اور یہ بتلانا نہیں کہ ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ ہدایہ کے شارحین نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں لکھا فتح القدیر، بنایۃ، عنایۃ اور کفایہ وغیرہ کو دیکھ لیجئے کسی نے نہیں لکھا کہ اجل کی وجہ سے شے کے ثمن میں اضافہ کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی کا اس کو ناجائز نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں پر مقصد اس کے جواز وعدم جواز سے بحث کرنا ہے ہی نہیں نیز جو معاملہ بدیہی طور پر ناجائز ہو اس کو ناجائز لکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے بہرحال کسی معاملے کے جائز یا ناجائز ہونے کا اصل معیار قرآن وحدیث اور ان کے اصول واحکام ہیں چنانچہ جو معاملہ ان کے مطابق ہو وہ جائز اور جو مطابق نہ ہو بلکہ خلاف ہو وہ ناجائز قرار پاتا ہے لوگوں کا اس کو کرنا یا نہ کرنا، اس کے جواز وعدم جواز کا کوئی معیار نہیں ورنہ شریعت ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی۔

ایک عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر (سنن ابوداود وترمذی)

علاوہ ازیں اگر مذکورہ عبارت یعنی "یزداد فی الثمن لاجل الاجل" سے یہ مفہوم ہے کہ اجل یعنی مہلت قرض کسی ثمن و قیمت کا عوض و بدل بن سکتی ہے تو تین سطروں کے بعد خود صاحب ہدایہ نے واضح الفاظ سے اسکی نفی کر دی ہے، فرمایا: "وان استهلكه ثم علم لزمه بالف ومائة لان الاجل لا يقابله شيءٌ من الثمن" اور اگر مذکورہ مثال میں خریدار نے خریدنے کے بعد غلام کو ہلاک یا فروخت وغیرہ کر دیا یعنی اسکے ہاتھ میں نہ رہا اور پھر اس کو یہ علم ہوا کہ وہ غلام ایک ہزار درہم میں ادھار پر خریدا گیا تھا اور ایک سو درہم منافع کیساتھ مجھ پر فروخت کیا گیا تو اب وہ فروخت کرنے والے سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا اور اس کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جو گیارہ سو درہم آپ کو دیئے ان میں جو اجل کا عوض تھے وہ مجھے واپس کر دو کیونکہ اجل ایک ایسی چیز ہے جس کے مقابلہ میں کوئی ثمن نہیں ہوسکتا۔ "لان الاجل لا يقابله شيء من الثمن" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اجل اور مہلت ادھار کے بالمقابل کوئی مال لینا دینا جائز نہیں، اور چونکہ ہمارے زیر بحث معاملہ میں بصورت ادھار نقد کے مقابلہ میں جو زائد قیمت لگائی جاتی ہے وہ اجل اور مدت ادھار کی وجہ سے لگائی جاتی ہے لہٰذا ہدایہ کی اس دوسری عبارت سے الٹا اس معاملے کا ناجائز ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ المبسوط اور الہدایہ کی جن عبارات سے معاملہ زیر بحث کے جواز کے لئے استدلال کیا گیا ہے کچھ بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ استدلال بے جان نظر آتا ہے اور ان عبارات سے کسی طرح اس معاملے کا جواز نہیں نکلتا جبکہ اس کے مقابلہ میں عدم جواز کے دلائل قرآن وحدیث سے متعلق رکھتے اور مضبوط و مستحکم دلائل ہیں جو قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے عرض کئے گئے ہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس مسئلہ پر ازسرنو پڑھیں اور غور فکر کریں گے اور پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ اس معاملے کی شرعی حیثیت کا تعین فرمائیں گے۔

عمدہ لکھائی ——— بہترین چھپائی
مسودہ دیجئے ——— کتاب لیجیے
جمیل برادرز
ناظم آباد نمبر ۲